جوش بانی

اقبال
جوش ملیح آبادی
فراق گورکھپوری
فیض احمد فیض
اختر شیرانی
ن.م.راشد
میراجی
علی سردار جعفری
سجاد ظہیر
مخدوم محی الدین
معین احسن جذبی
ساحر لدھیانوی
مجروح سلطانپوری
احسان دانش
احمد ندیم قاسمی
جمیل مظہری
اسرار الحق مجاز
مجنوں گورکھپوری
اختر الایمان
پرویز شاہدی
مسعود اختر جمال
شمیم کرہانی
سلام مچھلی شہری
نامی انصاری
معصوم رضا راہی
وامق جونپوری
نازش پرتاپگڈھی
رفعت سروش
نیاز حیدر
جاں نثار اختر
حسن نعیم
کیفی اعظمی
ساجدہ زیدی
نذیر بنارسی
قمر رئیس
سلیم احمد
محمد حسن
خلیل الرحمن اعظمی
اجمل اجملی
زاہدہ زیدی
زبیر رضوی
فہمیدہ ریاض
شہریار
باقر مہدی
اقبال حیدر
جاوید اختر
اشفاق حسین
ظفر گورکھپوری
نسیم سید
ندا فاضلی
پروین شیر
حسن عابد
شاہد ماہلی
شہاب جعفری
جمال اویسی
عارف نقوی
اقبال مرزا
عبدالاحد ساز
شہناز نبی

ترقی پسند نظم نمبر
2015

اردو ہماری مادری زبان ہے

اس کی حفاظت و ترقی ہمارا جذباتی و تہذیبی فریضہ ہے

سید محمد علی کاظمی

سابق ایڈوکیٹ جنرل، اتر پردیش

سابق چیئرمین اقلیتی کمیشن، اتر پردیش

صدر، علامہ اقبال اکیڈمی، الہ آباد

صدر، جوش و فراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد

جوش بانی ۵-۶

ترقی پسند نظم نمبر

مرتبین

اقبال حیدر

علی احمد فاطمی

معاونین

فخر الکریم

صالحہ زریں

نعیم السحر

عبدالحی

زندگی

جاں نثار اختر

تمتماتے ہوئے عارض پہ یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے اس درجہ خفا آپ سے اتنی بیزار
میں نے کب تیری محبت سے کیا ہے انکار
مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

سوچ دنیا سے الگ بھاگ کے جائیں گے کہاں
اپنی جنت بھی بسائیں تو بسائیں گے کہاں
امن اس عالم افکار میں پائیں گے کہاں
پھر زمانہ ہے نگاہوں کو چرانا کیسا
عشق کی ضد میں فرائض کو بھلانا کیسا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

تیر افلاس سے کتنوں کے کلیجے ہیں فگار
کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا غبار
کتنے چہرے نظر آتے ہیں تبسم کا مزار
اک نظر بھول کے اس سمت بھی دیکھا ہوتا
کچھ محبت کے سوا اور بھی سوچا ہوتا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

رنج و غربت کے سوا جبر کے پہلو بھی تو ہیں
جو ٹپکتے نہیں آنکھوں سے وہ آنسو بھی تو ہیں
زخم کھائے ہوئے مزدور کے بازو بھی تو ہیں
خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے
قلب انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے

سجاد ظہیر	آج رات	ندیم انصاری	206
علی سردار جعفری	مشرق و مغرب	عمر رضا	212
علی سردار جعفری	ایک خواب اور	ریشما پروین	221
معین احسن جذبی	فطرت ایک مفلس کی نظر میں	ابوظہیر ربانی	226
مجروح سلطانپوری	نوحہ سجاد ظہیر	لئیق احمد	231
ساحر لدھیانوی	اے شریف انسانوں	صالحہ زریں	234
ساحر لدھیانوی	چکلے	نغمہ جائسی	240
اسرار الحق مجاز	آوارہ	علی احمد فاطمی	244
اسرار الحق مجاز	اندھیری رات کا مسافر	نفیس بانو	256
احسان دانش	مزدور کی موت	نفیس بانو	266
جمیل مظہری	بعد المشرقین	راشد انور راشد	276
مجنوں گورکھپوری	بلبل	عصمت نیلو انصاری	285
پرویز شاہدی	شیروانی	شہناز نبی	289
وامق جونپوری	تقسیم پنجاب	فخر الکریم	297
مسعود اختر جمال	دعوت انقلاب	فخر الکریم	303
احمد ندیم قاسمی	پرواز جنوں	میراجی	308
سلام مچھلی شہری	کشمکش	ثروت خان	312
اختر الایمان	باز آمد	آصف زہری	318
اختر الایمان	اپاہج گاڑی کا آدمی	آصف زہری	326
جاں نثار اختر	زندگی	شبنم رضوی	341
کیفی اعظمی	ابن مریم	احسان حسن	346
کیفی اعظمی	عورت	طاہرہ پروین	355
شمیم کرہانی	روشنی تیز کرو	لئیق رضوی	362
نازش پرتاپگڈھی	انسان کی آواز	اسلم الہ آبادی	366
نیاز حیدر	سکل سمت سجل سندری	ظفر الدین احمد	372
معصوم رضا راہی	زندگی	علی حیدر رضوی	377
نامی انصاری	فلسطین	خان احمد فاروق	381
حسن نعیم	انقلاب آئے گا	ناصحہ عثمانی	389

رفعت سروش	درد کا رشتہ	ممتاز عالم رضوی	391
سلیم احمد	مکاشفہ	اقبال حیدر	396
محمد حسن	اعداد و شمار	نورینہ پروین	400
نذیر بنارسی	سر اسٹیفر ڈکرپس کے نام	شاہینہ رضوی	404
ساجدہ زیدی	نسل کشی	نعیم السحر صدیقی	409
زاہدہ زیدی	بند کمرہ	سیما صغیر	414
باقر مہدی	اپنی نظموں کے صحرا میں	عبدالاحد ساز	421
خلیل الرحمٰن اعظمی	میں گوتم نہیں ہوں	مہتاب حیدر نقوی	429
فہمیدہ ریاض	کبھی کبھی	طاہرہ پروین	435
شہریار	اڑان	خورشید احمد	438
زبیر رضوی	علی بن متقی رویا	نگینہ جبیں	442
اجمل اجملی	صلیب	سراج اجملی	447
نسیم سید	روٹی کے ٹکڑے اور کمبل	نگار عظیم	452
اقبال حیدر	حساب دوستاں در دل	حسنین اختر	458
اشفاق حسین	ایسے نہیں ہوتا	عبدالحی	463
پروین شیر	اب کہاں جاؤں	سید محمد عقیل	468
قمر رئیس	صدائے مانوس	خالد علوی	473
حسن عابد	کارواش	اقبال مجید	478
ظفر گورکھپوری	اکیسویں صدی	فضل امام	483
ندا فاضلی	کوئی اکیلا کہاں ہے	شہنواز عالم	486
جاوید اختر	فساد کے بعد	علی احمد فاطمی	492
شاہد ماہلی	واپسی	نشاط فاطمہ	498
شہاب جعفری	خونیں صدیاں	عابد سہیل	503
اقبال مرزا	عورت	نفیس احمد	506
عارف نقوی	راز ہستی	محمود الحسن رضوی	509
عبدالاحد ساز	آخری پیام	معید رشیدی	514
شہناز نبی	میں کیوں نہ مانوں	ندیم احمد	519
جمال اویسی	ماضی کی طرف	خواجہ جاوید اختر	524

زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

عرصہ دہر پہ سرمایہ و محنت کی یہ جنگ
امن وتہذیب کے رخسار کے اڑتا ہوا رنگ
یہ حکومت یہ غلامی یہ بغاوت کی امنگ
قلب آدم کے یہ رستے ہوئے کہنہ ناسور
اپنے احساس سے ہے فطرت انساں مجبور
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

آپ کو بند غلامی سے چھڑانا ہے ہمیں
خود محبت کو بھی آزاد بنانا ہے ہمیں
اک نئی طرز پہ دنیا کو سجانا ہے ہمیں
تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارا بن جا
تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارا بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

□□□

Analysis of Poem

تجزیہ

شبنم رضوی

'زندگی' کا موضوع اردو نظم میں اس قدر عام رہا ہے کہ اس پر نئے زاویے سے نظم کہنا مشکل رہا ہے۔ اقبال نے کچھ اس انداز سے زندگی کو خلاقانہ اور فلسفیانہ انداز سے پیش کر دیا کہ اس سے آگے جانا مشکل تو تھا لیکن ترقی پسند نظم نگاروں نے اسے مختلف زاویوں سے اور نظریوں سے پیش کرے نہ صرف اپنی فکر بلکہ زندگی کی بوالعجمی اور رنگارنگی کو بھی پیش کر دیا۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری کے ساتھ ساتھ جاں نثار اختر نے بھی زندگی کے عنوان سے نظم کہی، جس کی ابتدا یوں ہوتی ہے۔

تمتماتے ہوئے عارض پہ یہ اشکوں کی قطار
مجھ سے اس درجہ خفا آپ سے اتنی بیزار
میں نے کب تیری محبت سے کیا ہے انکار
مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

بعد کے دو مصرعوں کو ملاحظہ کیجئے عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن/ زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم۔ یاد کیجئے فیض کا مصرع تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔ یہاں محبت سے مراد محبوب کی عارضی محبت ظاہر ہے کہ زندگی کی دائمی محبت کے مقابلے کمزور اور معمولی۔ ترقی پسند شاعروں نے محبوب سے محبت اور زندگی سے محبت دونوں کو برابر کا درجہ تو دیا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اول کا تعلق جذباتی ہے، دوئم کا تعلق نظریاتی ہے۔ وہ زندگی سے محبت تو کرتا ہی ہے اس محبت کی طرف محبوب کو بھی راغب کرتا ہے۔ اسی لئے تیسرے ہی بند میں وہ صاف طور سے کہتا ہے۔

سوچ دنیا سے الگ بھاگ کے جائیں گے کہاں
اپنی جنت بھی بسائیں تو بسائیں گے کہاں
امن اس عالم افکار میں پائیں گے کہاں

اور آگے بڑھ کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

پھر زمانہ ہے نگاہوں کو چرانا کیسا

عشق کی ضد میں فرائض کو بھلانا کیسا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

اور پھر ترقی پسند شاعر کو نظریاتی فریضہ کے تحت وہ عام لوگ بھی نظر آتے ہیں جو پریشاں حال ہیں، غم زدہ ہیں اور جو دنیا کے ستائے ہوئے ہیں۔ اس مقام پر شاعر نہ صرف ان لوگوں کی طرف دیکھتا ہے بلکہ طنزاً محبوب سے کہتا بھی ہے۔

اک نظر بھول کے اس سمت بھی دیکھا ہوتا
کچھ محبت کے سوا اور بھی سوچا ہوتا

اس کے بعد شاعر نے زندگی وہ دلآویز، اذیتناک مناظر پیش کئے ہیں جس میں عام انسانوں کی عام تکلیفوں کا کربناک ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان مصرعوں سے شاعری کی رومانیت تو رخصت ہوتی ہی ہے اور تکلیف دہ حقیقت سامنے آتی ہے جس سے نظم کی جمالیات درہم برہم ہوتی ہے لیکن وہ لوگ حقیقت اور صداقت کی جمالیات پر یقین رکھتے ہیں وہ سستی اور سبک رومانیت سے پرہیز کرتے ہوئے زندگی کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور تصویروں کو پیش کرنے کی جسارت کرتے ہیں جن کو عام طور پر اردو کا شاعر اور شاعری قبول نہیں کرتے۔ اب ذرا ان مصرعوں کو ملاحظہ کیجئے۔

رنج و غربت کے سوا جبر کے پہلو بھی تو ہیں
جو ٹپکتے نہیں آنکھوں سے وہ آنسو بھی تو ہیں
خاک اور خون میں غلطاں ہیں نظارے کتنے
قلب انساں میں دہکتے ہیں شرارے کتنے

اور آگے بڑھ کر شاعر تاریخ و تہذیب کے ان پہلوؤں کو چھوتا ہے جس سے نظم کی وسعت اور نفس مضمون مزید پختہ اور اثر انگیز ہوتا ہے۔

عرصہ دہر پہ سرمایہ و محنت کی یہ جنگ
امن و تہذیب کے رخسار کے اڑتا ہوا رنگ
یہ حکومت یہ غلامی یہ بغاوت کی امنگ
قلب آدم کے یہ رستے ہوئے کہنہ ناسور
اپنے احساس سے ہے فطرت انساں مجبور

ان تمام صورتوں کو پیش کرنے کے بعد ترقی پسند شاعر عام طور پر اپنی نظم کا خاتمہ امید و نشاط حوصلہ و ولولہ پر ختم کرتے ہیں۔ ایک نئے سفر کا عزم کرتے ہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ اس سفر

میں محبوب کو بھی شامل کرتے ہیں کہ وہ بھی کوئی خاص محبوب نہیں بلکہ ایک عام انسان ہے۔ آخر کے دو بند دیکھئے۔

آپ کو بند غلامی سے چھڑانا ہے تجھے
خود محبت کو بھی آزاد بنانا ہے تجھے
اک نئی طرز پہ دنیا کو سجانا ہے تجھے
تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارا بن جا
تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارا بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم

نرم و نازک محبوب کو شرارہ بننے کی دعوت صرف ترقی پسند نظم میں ملے گی۔ عرش بغاوت پر ستارہ بننے کی جسارت ترقی پسند نظم کا خاص استعارہ ہے۔ اس سے ترقی پسند نظم کی شناخت ہوتی ہے۔ ہر چند کہ اس نظم میں اقبال، جوش، فیض کے اثرات نظر آتے ہیں تاہم جاں نثار اختر کا اپنا رنگ سمایا ہوا ہے جس سے یہ نظم عمدہ اور معنی خیز ہوگئی ہے۔

□□□

صف اول کے ادیب ناقد اور دانشور
پروفیسر وہاب اشرفی
کی تازہ کتاب
مارکسی فلسفہ اشتراکیت
اور اردو ادب
ایک یادگار کتاب ایک تاریخی کام۔

نقشِ نو

۲۰۱۲ء ـ ۲۰۱۳ء

(بیسویں اٹھارہویں صدی کی دلی میر کا غم دوراں اور شعرائے معاصرین میں پیش کردہ مقالات)

سالانہ عالمی اردو جریدہ

شعبۂ اردو

گرلس ڈگری کالج، الہ آباد

الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

ISSN 2320-3781

Naqsh-e-Nau

International Annual Urdu Journal 2012-13

Published by
Dept. of Urdu, Hamidia Girls' Degree College
Allahabad

شبنم رضوی

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے

ڈائس پر تشریف فرما ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی، ڈاکٹر احمد محفوظ، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین

نقشِ نو

سالانہ عالمی جریدہ

شمارہ پنجم

۲۰۱۲ء ـ ۲۰۱۳ء

مدیر: ناصحہ عثمانی معاون مدیر: زرینہ بیگم

شعبۂ اردو

حمیدیہ گرلز ڈگری کالج

الہ آباد سنٹرل یونیورسٹی، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

'نقشِ نو' سالانہ عالمی جریدہ ۔ شمارہ پنجم

سرپرست: مسز تزئین احسان اللہ **نگراں:** ڈاکٹر ریحانہ طارق

مجلسِ مشاورت:

پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی

پروفیسر محمود الٰہی

پروفیسر عبدالباری

مجلسِ ادارت:

اعزازی مدیر — پروفیسر عبدالحق

مدیر — مسز ناصحہ عثمانی

معاون مدیر — مسز زرینہ بیگم

معاونین:

ڈاکٹر یوسف نفیس — ڈاکٹر ندرت محمود

ڈاکٹر نسرین بیگم — ڈاکٹر شبانہ عزیز

کمپیوٹر کمپوزنگ: مسز شمیمہ یاسمین

ناشر: شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج، نور اللہ روڈ، الہ آباد۔ یو۔ پی۔ انڈیا

فون نمبر: 0532-2656526 **موبائل نمبر:** 9559258741

ای میل: naqshe_nau@yahoo.in

hamidia_alld@yahoo.co.in

naseha29@yahoo.co.in

ISSN 2320 - 3781 Naqsh-E-Nau

قیمت: اندرونِ ملک 100 روپئے ، بیرونِ ملک 5 ڈالر (ڈاک خرچ الگ)

'نقشِ نو' کے مشمولات میں ظاہر کردہ نفسِ مضمون سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

(جملہ حقوق بحقِ شعبۂ اردو، حمیدیہ گرلز ڈگری کالج محفوظ ہیں۔)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱۔	پیش لفظ	مسز ناصحہ عثمانی	۱
۲۔	حرفے چند	ڈاکٹر ریحانہ طارق	۴
۳۔	کلیدی خطبہ	پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی	۶
۴۔	خطبہ مہمانِ خصوصی	پروفیسر خواجہ اکرام الدین	۱۳
۵۔	میرؔ کی دلّی اور میرؔ کا غمِ دوراں	پروفیسر عبدالقادر جعفری	۱۸
۶۔	شہر کی جمالیات اور میرؔ	ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی	۲۷
۷۔	میرؔ کی خیال بندی	ڈاکٹر احمد محفوظ	۳۶
۸۔	میرؔ کی شاعری اور ماس کمیونی کیشن	ڈاکٹر اسلم جمشید پوری	۴۹
۹۔	مطالعۂ میرؔ کی ایک جہت کا خاکہ	ڈاکٹر سراج اجملی	۵۹
۱۰۔	تصوّف اور میرؔ کی غزلیہ شاعری	ڈاکٹر نفیس بانو	۶۶
۱۱۔	خواجہ میر دردؔ کی عشقیہ شاعری	ڈاکٹر شہناز صبیح	۷۸
۱۲۔	معاصر میرؔ قائم چاند پوری	ڈاکٹر محمد ارشد رضوی	۸۶
۱۳۔	اٹھارہویں صدی کی دلّی کی کہانی میرؔ۔۔۔۔	ڈاکٹر یوسف نفیس	۹۷
۱۴۔	تفہیمِ میرؔ اور ترقی پسند تنقید	ڈاکٹر ریشماں	۱۱۸
۱۵۔	میرؔ قیام لکھنؤ کے حوالے سے	ڈاکٹر شبنم رضوی	۱۵۲
۱۶۔	میرؔ کا تصورِ زندگی	مسز ناصحہ عثمانی	۱۶۲
۱۷۔	'ذکرِ میرؔ' پر ایک نظر	ڈاکٹر شبانہ عزیز	۱۷۱
۱۸۔	میرؔ اور نظیرؔ کی مزاجی انفرادیت اور۔۔۔۔۔	ڈاکٹر نگینہ جبیں	۱۷۷

میر تقی میرؔ قیامِ لکھنؤ کے حوالے سے

میر تقی میر اور قیامِ لکھنؤ کے حوالے سے سب سے پہلے یہی سوال آتا ہے کہ میرؔ کو لکھنؤ بلایا گیا؟ یا میرؔ چلے آئے! اس ضمن میں سب سے قابلِ قدر کتاب میر کی سوانح عمری ''ذکر میر'' ہے۔ لکھنؤ کی آمد کے سلسلے میں میر تحریر کرتے ہیں کہ:

''فقیر (میرؔ) خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر (دہلی) سے نکل جاؤں مگر اسباب و وسائل کا فقدان قدم نہیں نکالنے دیتا تھا۔ میری عزّت و آبرو کے تحفّظ کے لئے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کو خیال آیا کہ میرؔ میرے پاس نہیں آتا۔ نواب سالار جنگ پسر اسحاق خاں موتمن الدولہ جو اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی اور وزیرِ اعظم کے خالو ہوتے تھے، ان پرانے روابط پر نظر کر کے جو میرے (سوتیلے) ماموں (خان آرزو) سے تھے کہا ''اگر نواب فرمادیں (تو) میرؔ ضرور آجائے گا۔'' حکم ہوا کہ ایسا کیا جائے۔ انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا کہ ''نواب والا جواب تمھیں طلب فرماتے ہیں۔ جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ۔'' میں تو دل برداشتہ بیٹھا ہی تھا خط پاتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔''

(میرؔ کی آپ بیتی۔ صفحہ ۱۷۸)

میرؔ کے اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ میرؔ کو باقاعدہ رقعہ اور زادِ راہ بھیج کر بلایا گیا۔ اس بات کی تائید کئی تذکروں کے علاوہ ناقدین بھی کر چکے ہیں۔ مگر جب محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس قول کے برعکس باتیں ہیں:

ڈاکٹر شبنم رضوی، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، کرامت حسین مسلم گرلز پی۔ جی۔ کالج لکھنؤ

''(میرؔ) جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایا بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلّی کو خدا حافظ کہا۔''

(آب حیات۔ صفحہ ۱۹۵)

اس حوالے سے دو مطلب نکالے جا سکتے ہیں یا تو آصف الدولہ نے میرؔ کو بلایا ہی نہیں اور زادِ راہ بھیجا ہی نہیں، یا پھر زادِ راہ بھیجا تو اتنا کم بھیجا کہ کرایہ مکمل کرنے کے لئے کسی غیر کا سہارا لینا پڑا۔ خیر میرؔ دلّی کیوں چھوڑنا چاہتے تھے اور لکھنؤ کیوں آنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا قول قابلِ بیان ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اہلِ ہنر ایک ایک کر کے دلّی چھوڑ رہے تھے۔ سوداؔ اور سوزؔ جا چکے تھے۔ شاہ حاتم نے شاہ تسلیم کے تکیے میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ دردؔ مسندِ فقیر پر بیٹھے تھے۔ دلّی میں یہ عالم تھا کہ خود بادشاہ وقت شاہ عالم بھی گدا تھا، وہ دوسروں کی کیا مدد کرتا۔ میرؔ کی حالت خراب تھی، وہ دوسروں کی امداد پر زندگی گزار رہے تھے اور اس زندگی سے اتنے عاجز آ چکے تھے کہ کوئی بھی ذرا سا سہارا دیتا تو وہ اس کے پاس چلے جاتے۔ میرؔ کے دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے موجود تھی کہ وہ بھی لکھنؤ جا کر دربارِ اودھ سے وابستہ ہو جائیں۔ کلّیات میرؔ میں ایک مثنوی 'در بیان کد خدائی' نواب آصف الدولہ بہادر کی ملتی ہے .....میرؔ کی یہ مثنوی اس چھپی ہوئی خواہش کا اظہار تھی۔''

(میر تقی میرؔ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: صفحہ ۳۲)

اس سلسلے میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ۱۷۸۱ء میں سوداؔ کے انتقال کے بعد آصف الدولہ کو خیال ہوتا ہے کہ میرؔ خود بھی چاہتے تھے کہ لکھنؤ آ کر شاہان اودھ سے وابستہ ہو جائیں اور نواب آصف الدولہ کی بھی یہی خواہش تھی۔

''آب حیات'' کے حوالے سے جو دوسری بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ میرؔ جس شخص کے ساتھ دلّی سے اور تمام راستے خاموش رہے۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ:

''تھوڑی دور چل کر آگے اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ (میرؔ) اس کی طرف سے منھ پھیر کر بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بات کی۔ میرؔ صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میرؔ صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔''

(آب حیات۔۱۹۶)

''آب حیات'' کے اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس کس مپرسی کے عالم میں میرؔ دلّی سے لکھنؤ واپس آئے۔ ایسے میں جب خود میرؔ زادِ راہ اور بلائے جانے کی بات قبول کر چکے تھے تو پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ محمد حسین آزاد کو غلط بیانی سے کام لینے کی کیا ضرورت تھی؟

قیامِ لکھنؤ کے سلسلے میں دوسری غلط فہمی یہ پیدا ہوگئی کہ اگر آصف الدولہ نے بلایا تھا تو ٹھہرنے کا انتظام بھی کیا ہوگا۔ میرؔ نواب کے مہمان تھے اور شاعری کے بادشاہ۔ ایسے میں میرؔ کا سرائے میں ٹھہرنا بغیر بلائے مشاعرے میں جانا اور وہاں ان کا مذاق اڑنا وغیرہ وغیرہ۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ:

''لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے، ایک سرائے میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج مشاعرہ ہے، میرؔ نہ رہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ، کھڑکی دار پگڑی، پچاس گز کے گھیر کا پاجامہ، ایک پورا تھان پستولئے کا کمر

سے بندھا، ایک رومال پٹری دار تہہ کیا ہوا اس میں آویزاں، مشروع کا پاجامہ، جس کے عرض کے پائچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی، جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف بھی بندھی تلوار، دوسری طرف کٹار، ہاتھ میں جریب۔ غرض جب جب داخل ہوئے تو وہ شہر لکھنؤ۔ نئے انداز، نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوان جمع انھیں دیکھ سب ہنسنے لگے۔

(آب حیات۔۱۹۶)

میرؔ صاحب بیچارے غریب الوطن، زمانے کے ہاتھ سے پہلے بھی دل شکستہ تھے اور بھی دل تنگ ہوئے اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے۔ میرؔ صاحب نے قطعہ فی البدیہہ لے کر غزل طرحی میں داخل کیا۔''

(آب حیات۔ص۱۹۶)

غزل۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

''ذکر میرؔ'' میں اتنے اہم واقعہ کا ذکر تک نہیں ملتا۔ حقیقت میں میرؔ نے اپنے بارے میں کم سے کم معلومات فراہم کرائی ہے اور بہت ساری اہم باتوں کو بیان کرنے سے پرہیز بھی کیا ہے۔ ''آب حیات'' میں جس طرح سے میرؔ کے وضع ولباس کا بیان کیا ہے اور میرؔ کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جیسے میرؔ کا لباس، یہ تلوار، یہ جوتی، یہ پگڑ سب بہت عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ میرؔ کے

حالات اتنے عمدہ لباس کی اجازت نہیں دیتے۔

''ذکرِ میر'' میں لکھنؤ آنے کا جو ذکر ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر کی لکھنؤ آمد پر بہت عزّت افزائی کی گئی اور بہت احترام سے ان کا استقبال کیا گیا۔ میر لکھتے ہیں کہ:

''انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے ایک خط لکھا کہ نواب والا جناب تمھیں فلک فرماتے ہیں جس طرح بھی بن پڑے خود کو یہاں پہنچاؤ..... پہلے نواب سالار جنگ کے گھر گیا۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ اپنوں نے میری بڑی عزّت کی اور میرے لئے ضروری چیزیں بندگانِ عالی (آصف الدولہ) سے کہہ کر بھجوادیں''

(ذکرِ میر۔۱۷۹)

کچھ اسی قسم کی باتیں ہمیں ''تاریخ ادب اردو'' جلد دوم کے صفحہ نمبر ۵۵ پر بھی ملتی ہے:

''(میر) لکھنؤ آئے اور سیدھے سالار جنگ کے گھر پہنچے۔ چار پانچ دن بعد آصف الدولہ مرغ بازی کے لئے آئے، میر بھی وہاں موجود تھے۔ ملاقات ہوئی اور اپنے شعر سنائے۔ سالار جنگ نے نواب کو یاد دلایا۔ نواب نے چند دن بعد میر کو بُلوایا۔ میر نے قصیدہ پیش کیا اور ملازم ہوگئے۔''

(تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم از جمیل جالبی ص: ۵۱۵)

لکھنؤ میں میر کی آمد اور ملازمت اختیار کرنا خوشی کا باعث رہا ہوگا، کیوں کہ یہاں میر کو تین سو روپیہ کی ملازمت ملی تھی۔ ''تذکرہ گلشنِ ہند'' کے مطابق میر کو تین سو روپیہ اور ''تذکرہ سفینۂ ہندی'' کے مطابق دو سو روپئے ماہوار مقرر ہوئے۔ میر کو چاہے دو سو ملا یا تین سو، بہر حال اس بے روزگاری کے زمانے میں اور پہلے دلّی میں بائیس روپئے ماہوار کے مقابلے میں یہ رقم ضرور بہت رہی ہوگی اور خوب رہی ہوگی۔ کاظم علی خاں لکھتے ہیں کہ:

''دلّی میں میر کی زندگی کا دامن پھولوں سے خالی اور کانٹوں سے تار تار رہا۔ لکھنؤ نے میر کے دامنِ حیات کو کانٹوں سے خالی کر کے پھولوں سے پُر کر دیا۔ دلّی نے میر کے جس دل کے چراغ مفلس کی طرح بجھا کر رکھ دیا تھا، لکھنؤ نے اس بجھے دیے کو امید کی روشنی دی۔ دلّی سے میر اپنے ساتھ صرف ناکامیوں کا زخم لائے تھے، لکھنؤ نے اس زخم کے لئے کامرانیوں کا مرہم فراہم کیا۔''

(آجکل، نئی دہلی کاظم علی خاں۔ صفحہ ۸۶)

آصف الدولہ سے لے کر سعادت علی خاں نے میر کو بہت مرتبہ اعزاز و اکرام سے نوازا اور دل جوئی کی مگر میر اپنی تنک مزاجی، خودداری کو بھی وضع داری سمجھتے رہے۔ حالانکہ شاہانِ اودھ نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کی ہر طرح ناز برداری کی، پھر بھی وہ کبھی بھی درباری شاعر نہ بن پائے۔ میر کی زندگی بڑے سکون اور آرام سے کٹتی۔ میر لکھتے ہیں کہ:

''یہاں فقیر (میر) نواب صاحب (آصف الدولہ) کے ساتھ ہے اور ان کی دُعا گوئی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔''

(میر کی آپ بیتی۔ صفحہ ۱۸۶)

لکھنؤ میں میر تقی میر آصف الدولہ کے ساتھ رہے۔ دو مرتبہ شکار پر گئے۔ شادی بیاہ، میلے ٹھیلے، محفلوں اور اسی قسم کی تقریبات میں ساتھ رہے اور ان واقعات کو نظموں میں محفوظ رکھتے۔ میر کے شکار نامے اس کی عمدہ مثال ہیں۔

میر آصف الدولہ کی فیاضی سے بہت خوش رہتے اور ان کو اکثر ''سخن ور نواز'' اور ''عاشقِ ہنر'' کہا کرتے۔ میر نے اپنے صید ناموں میں شکار کی پوری تفصیل پیش کی ہے۔ جانوروں کے علاوہ جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کا حال نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ دوران مطالعہ ایسا سماں بندھ جاتا ہے پڑھتے پڑھتے شکار نامے میں انسان کھو سا جاتا ہے۔ شاہی

تقاریب کے سلسلے میں میرؔ نے کئی مثنویاں بھی جیسے ہولی، ساقی نامہ وغیرہ بھی تحریر کیا ہے۔

ان ساقی ناموں میں ''ہولی'' کی مثنویوں میں میرؔ نے خوب دل کھول کر عیش وعشرت کی داد دی ہے۔ ان مثنویوں میں عہد آصف الدولہ کی شان وشوکت کے علاوہ آتش بازی اور رنگ کھیلنے کے دلکش مناظر دکھائے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی بحران کے زمانے میں بھی ہماری معاشرت اور تہذیب کے رشتے نہایت مضبوط تھے۔ اس دوران تمام ہندو مسلمان ایک ہی رنگ میں نظر آتے ہیں۔ میرؔ نے لکھنؤ کے کھیل تماشوں کے حال بھی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ کے جلوس، دادوعیش کی محفلوں انعام واکرام اور انواع و اقسام کے کھانوں کا ذکر ملتا ہے۔ لکھنؤ میں گورنر کے آنے پر جس طرح کا اہتمام ہوا تھا ''ذکر میرؔ'' میں میرؔ عمدہ بیان کرتے ہیں:

''ایک منزل پہلے نواب گردوں رکاب سے ملاقات ہوئی وہاں سے اپنے ساتھ لکھنؤ لائے جو سلطنت کا صدر مقام ہے۔ ہر منزل پر نئی نئی ضیافت ہوتی تھی۔ نئے نئے خیمے، عجیب وغریب کھانے، ترکی و تازی گھوڑے، کوہ پیکر ہاتھی، قیمتی پوشاک اور جواہر کی کشتیاں، خوش گوار شربت اور انگنت میوے، اس علاقے کے اچھے تحفے.....

مکان کے کونوں میں گلاب چھڑکا ہوا، نرم و ملائم بستر خواب، معطّر و معنبر لباس، مخمل کے اچھوتے فرش، سیم گل کی ہوئی دیواریں، پردوں اور جھالروں سے آراستہ ایوان، عنبر کی خوشبو عجیب مستی آفریں تھی۔ بھنے ہوئے پستے اور بادام اور انگریزی چیزیں شغل کے لئے رکھی ہوئی.....طرح طرح کے خوش رنگ شربت، قسم قسم کی بنی ہوئی روٹیاں تھیں۔ نانِ بادام بڑی نزاکت سے (بنی ہوئی) شیر مال اور باقر خانی خورشید کی مثل (صاف وگرم) نان جوان جیسی کہ (واقعی)

بوڑھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ نانِ درتی کی تعریف کروں تو دفتر بھر جائے۔ نانِ زنجبیلی کو دیکھ کر ذائقہ محفوظ (ہوتا ہے) ہر نوع کے قلیے، دو پیازے رکھے تھے کہ تمام مہمانوں کا بھی للچا رہا تھا۔ کئی قسم کے کباب دسترخوان پر حاضر تھے۔''

(میرؔ کی آپ بیتی۔ صفحہ ۱۸۳۔۱۸۴)

میرؔ اور لکھنؤ کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن نشین رکھنا ضروری ہے کہ آصف الدولہ شیعہ تھے اور محرّم کا خاص اہتمام ہوا کرتا تھا۔ ایسے میں میرؔ کے مرثیوں کی ایک خاص اہمیت رہی ہوگی۔ میرؔ نے اپنے مرثیوں میں امام حسین کی شہادت، حجرت عابد کی مصیبت، تنہائی، بے کسی، بے بسی، عورتوں اور بچوں کی فریادیں، رونا وغیرہ کو خاص موضوع بنایا ہے، جن میں میرؔ نے اپنے ہنر کا کمال دکھایا ہے۔

بقول محمد حسین آزاد میرؔ اپنی زبان کے لئے بڑے محتاط تھے اور دہلی سے لکھنؤ تک کا سفر خاموشی سے اس لئے کرتے ہیں کہ میری زبان خرب ہوتی ہے۔ یہ ''آب حیات'' کا بہت مشہور قصہ ہے جو کچھ یوں ہے:

''تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منھ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میرؔ صاحب چین بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق۔ اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میرؔ صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے۔''[1]

اس سلسلہ میں پروفیسر شارب ردولوی صاحب کا خیال محمد حسین آزاد کے خیال کو

رد کرنے کے لئے کافی ہوگا:

''میرؔ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ لکھنؤ کے سفر میں اپنے ہم سفر کی بات کرنے کی خواہش کو یہ کہہ کر رد دیا تھا کہ آپ کا وقت کٹتا ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔ لیکن وہی میرؔ بے جھجک اپنی شاعری میں برج، پراکرت، دکنی اور نہ جانے کہاں کہاں کے غیر مستعمل الفاظ نظم کرتے چلے جاتے ہیں اور اس عہد کے کلاسیکی مزاج اور نفاست پسند شعری ذوق رکھنے والے قاری اور سامع کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتے۔''[۲]

اسی طرح خواجہ احمد فاروقی نے میرؔ کی شاعری میں استعمال ہونے والے خاص الفاظ و محاورات کا بھی ذخیرہ پیش کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر تقی میرؔ کی زبان کیسی تھی:

''پاکھر، کوئل، گنج، باڑ جھڑی، ہوائی، زنار، مہتابی، بان، کھانچہ، ٹک، مرغ باز، کٹیل، ردا، منڈیر، ڈانس، جھینگر، چڑی، کیچوا، بنڈیلا، ٹڈی، بزہ، اڑانا، اڑواڑ، ارنا، اُسارا، باندھسو، بہروپیہ، پرنل، توشہ کی روٹی..... جامہ خانہ، جناع، اجھا، مجھ، چھاپا کا، جھمکا، جھوجرا، جھینگا، چراغ، جوبالا، وغیرہ وغیرہ''[۳]

اسی قسم کی لمبی فہرست خواجہ احمد فاروقی نے پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ عوام کی زبان استعمال کرنے والا انسان کیوں کر انسان سے دور رہ سکتا ہے۔ لہٰذا میرؔ پر اپنی زبان خراب ہونے کے ڈر سے خاموش سفر کرنے کا الزام بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔

میرؔ کی شاعری پر لکھنؤ کا زبردست اثر ہوا۔ اسی لئے لکھنؤ میں شائع ہونے والا میرؔ کا چھٹا دیوان کئی معنی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مالک رام نے اس کو قیام لکھنؤ کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں کاظم علی خاں کا قول درست معلوم ہوتا ہے:

''میرؔ نے دہلی میں شباب کا دور گذارا تھا۔ جو پر گوئی کے لئے موزوں ہوا ہے۔ اس کے برعکس میرؔ جب ۶۱ برس کی عمر میں لکھنؤ آئے تو بڑھاپے نے ان کی پر گوئی پر روک لگا دی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ میں مکمل ہونے والے چار دواوین دہلی کے مقابلے میں اشعار اور غزلیات کی تعداد کے اعتبار سے پیچھے رہ گئے۔''

(آجکل، مارچ ۱۹۸۴ء۔ صفحہ ۸۴)

اس جائزے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب میرؔ لکھنؤ آئے اس وقت عمر ۶۱ برس تھی اور پاس میں صرف دو دیوان مکمل تھے۔ باقی چار دواوین کی تکمیل میرؔ کے قیام لکھنؤ کی خوش گواریادوں میں سے ایک ہے۔ گویا بہ لحاظ تعداد دواوین میر کا قیام لکھنؤ میرؔ کے ادبی قد و قامت کو بلند تر کرنے میں یقیناً کامیاب ہے۔ اس لئے میریات کے سلسلے میں لکھنؤ کے اس اہم کارنامے کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔

حواشی:

۱۔ میرؔ کی آپ بیتی۔ — نثار احمد فاروقی

۲۔ آب حیات۔ — محمد حسین آزاد

۳۔ میر تقی میرؔ۔ — جمیل جالبی

۴۔ میر تقی میرؔ۔ — نثار احمد فاروقی

۵۔ تاریخ ادب اردو (جلد دوم)۔ — ڈاکٹر جمیل جالبی

۶۔ تلاشِ میرؔ۔ — نثار احمد فاروقی

۷۔ دلّی کا دبستان شاعری۔ — ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی

۸۔ میر تقی میرؔ حیات اور شاعری۔ — خواجہ احمد فاروقی

۹۔ نیا دور (میرؔ نمبر)۔ — مئی، جون ۲۰۱۰ء

KHUDDAM
RAFAT